معرکۂ اسلام و جاہلیت

بدء الاسلام غریبا و سیعود غریبا

(۲)

(از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

حق و باطل کی فطری آویزش کا یہی وہ فلسفہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَءَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ (مسلم)

اسلام کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ "غریب" تھا اور پھر ایک وقت آئیگا کہ وہ پہلے کی طرح ہو جائیگا پس مبارکی ہو "غربا" کیلیے۔

لفظ "غریب" کی تفسیر میں عجیب عجیب باتیں کہی گئی ہیں جن سے نہ تو کلام میں کوئی معنویت پیدا ہوتی ہے اور نہ ذوق ادب اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے فطری جزر و مد کا جو فلسفہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے اکثر لوگوں کی نگاہیں اسکی تہ تک نہ پہنچ سکیں۔ اس لیے کسی نے "غریب" کی تشریح مفلس و نادار سے کی، اور کسی نے ادب و لغت کا کچھ لحاظ کیا تو اس کے معنی مسافر کے قرار دے دیے۔ حالانکہ یہ اور اس قسم کے تمام اقوال مضمون حدیث سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ یہاں غریب کے معنی ہیں اجنبی اور غیر مانوس کے۔ مسافر کو غریب اسی بنا پر کہتے ہیں کہ وہ ایک اجنبی اور بیگانہ ماحول میں ہوتا ہے، جہاں اسکی ذات و صفات سے لوگوں کو کوئی واقفیت اور انسیت نہیں ہوتی لیکن

اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ غریب بس مسافر ہی ہوسکتا ہے۔ اصل غرابت صورت و شکل اور وضع و قطع کی نہیں ہے بلکہ خیالات و نظریات، مذاق و مزاج اور عادات و خصائل کی ہے۔ ایک شخص اپنے احباب و اقارب میں ہوتے ہوئے بھی غریب سے غریب تر ہوسکتا ہے اگر اسکی طبیعت ان سے نہ ملتی ہو اور اسکے افکار و تصورات ان سے بالکل نرالے اور مختلف ہوں۔ پس اسلام کے "غریب" ہونے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسکی ابتدا بھی حالت مسافرت اور خانہ بدوشی میں ہوئی تھی اور انتہا بھی ہوگی۔ اور نہ اس فرمودۂ حکمت کا یہ مطلب ہے کہ دولت اور اسلام باہم اضداد ہیں، پہلے بھی یہ مفلسوں کا مذہب تھا اور آخر میں بھی مفلسوں ہی کا مذہب ہوگا۔ بلکہ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام جب آیا تو وہ اپنی خالص عقلیت، اپنی بے آمیز فطریت، اپنے تصورات کی رفعت اور اپنے اصولوں کی پاکیزگی کے اعتبار سے اُس دنیا کے لیے بالکل نرالا، بالکل اجنبی اور بیگانہ تھا جو نفس پرستوں اور رسمیات کے بندوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسی طرح پھر ایک دور ایسا آنے والا ہے جب دنیا اسی طرح جاہلیت میں مبتلا ہوگی اور اسلام اس میں ویسا ہی اجنبی اور بیگانہ ہو جائیگا۔ اس کا نظام تہذیب، اسکے قوانین معاشرت، اس کے اصول سیاست سب کے سب دنیا کیلیے نامانوس اور ناقابلِ گرفت ہو جائینگے۔ لوگوں کے تنگ دماغ میں اس وسیع اور بلند نظامِ زندگی کا تخیل سما ہی نہ سکیگا جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ سارا عالم جاہلیت کی تیرگیوں میں گھرا ہوگا مگر اس چمکتی ہوئی کافوری شمع سے وحشت کھائیگا جسکی شعاعیں قرآن کے سینے سے پھوٹ رہی ہونگی۔ اس سے روشنی حاصل کرنا بے عقلی سمجھا جائیگا۔ اس سے روشنی حاصل کرنیوالوں کا مذاق اڑایا جائیگا، اور ان پر پھبتیاں کسی جائینگی۔ پس جاہلیت کے اس چھا جانیوالے سیلاب میں جس کا قدم جمارہا، جس نے اس "نامانوس" صدا کے ورد سے اپنی زبان نہ روکی، جس نے اسلام کی اسپرٹ پوری طرح سمجھنے سمجھانے اور اسی پر عمل کرنے میں زندگی بسر کی، جس نے ہوا پرستی کے طوفانِ عام میں عقل کا سررشتہ نہ چھوڑا یعنی جو اپنوں میں رہکر بھی بیگانہ رہا، وہی "غریب" ہے اور اسی کیلیے مبارکی ہے۔

سرکار رسالتمآب کا یہ بیان کس قدر صحیح اور یہ پیشینگوئی کس قدر سچی ہے۔ پرانی جاہلیت میں بھی اسلام غریب تھا اور نئی جاہلیت میں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ پھر غریب نظر آرہا ہے۔

جب اسلام کی دعوت ابتدا میں ظاہر ہوئی تو صرف یہی نہ ہوا کہ توحید اور معاد اور وحی اور رسالت جیسے اعلیٰ و ارفع حقائق پر جاہلیت کے غلافوں میں لپٹی ہوئی عقلوں نے حیرت اور اچنبھے کا اظہار کیا ہو، بلکہ عام دنیوی معاملات میں بھی جن احکام اور جن اصولوں کی حکمتیں بالکل واضح اور مصلحتیں بالکل نمایاں تھیں، دنیا والوں کی عقل نے انھیں بھی سمجھنے اور ماننے سے برملا انکار کردیا۔ بلکہ آگے بڑھکر اگر تم خود صحابۂ کرام کے حالات پر گہری نظر ڈالو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اسلامی تصورات کی پاکیزگی اور بلندی کو پوری طرح سمجھنے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے میں ایسی بے نفس اور حق آگاہ جماعت کو بھی کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ گاہے بگاہے پرانے غیر اسلامی جذبات و تخیلات کس طرح انکے ذہن پر ابھر آتے تھے اور رسول اللہ صلعم نے کتنی جانفشانیوں کے بعد انکے دلوں سے جاہلیت کا زنگ کھرچنے میں کامیابی حاصل کی؟

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکا مشاہدہ عقائد کے علاوہ اسلامی نظام کے ایک ایک شعبہ اور جزئیہ میں کیا جاسکتا ہے۔

خود اسلام کی ہیئت ترکیبی کو لیجیے جب اس نے انسانی حرکات و سکنات کے ایک ایک گوشہ میں تقویٰ اور پاکیزگی کا رنگ بھرنا چاہا، لوگوں کے تمام افکار و عواطف پر بندشیں لگانی شروع کیں اور اخلاق و معاملات کے اندر باطل کے منافذ ایک ایک کرکے بند کرنے شروع کیے تو کفار و منافقین اس کلیت اور ہمہ گیری کا مذاق اڑاتے تھے۔ مذہب کا جو جاہلی تصور ان کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا، اور چند لایعنی رسوم کو مذہب کا نام دیکر بطور ضمیمۂ زندگی اس سے واسطہ رکھنے کے جس طرح وہ عادی بن چکے تھے اسکے پیش نظر جب وہ دیکھتے کہ یہ مذہب آزادی و اباحت نفسانی کے تمام ناکوں پر اپنا نقیب اور داروغہ مقرر کررہا ہے، زندگی کے ایک ایک قدم پر جزا و سزا کا قانون سنا رہا ہے، اعمال و معاملات

کے تمام متفرق جزئیات کو چن چن کر ایک نظام زندگی کے شیرازہ میں باندھتا جا رہا ہے، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہونا چاہتا ہے، اور زندگی ہی نہیں بلکہ موت اور موت کے بعد تک بھی انسان اس کے متعین حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، تو اس انقلابی تصور مذہب سے جس کی تشکیل میں جاہلیت اور نفسانیت کو مطلقاً کوئی حق نہ دیا گیا تھا، وہ سخت نفرت اور اجنبیت محسوس کرتے، مسلمانوں کی بے عقلی پر ماتم کرتے، اور ان پر آوازے کستے۔ ایک منافق نے حضرت سلمان فارسیؓ سے از راہ طعن پوچھا کیوں جی سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر ہر چھوٹی بڑی چیز میں مذہبیت پیدا کرتے ہیں، حتیٰ کہ طہارت اور استنجا کے اصول و آداب بھی بتاتے ہیں؟

گویا ان "روشن خیالوں" کے نزدیک وہ مذہب مذہب ہی نہیں جو ہر لمحہ انسانی اعمال و عقائد اور معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لیے رہے۔

اسلام جس وقت آیا اس وقت "حکومت" کے متعلق ان لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ کرو جو بادشاہت کو خواہشات نفسانی کا آلۂ کار سمجھتے تھے۔ جنکے یہاں حکومت کا استحقاق نسلی عصبیت اور آبائی وارثت کا رہین منت ہوا کرتا تھا۔ جو تخت خسروی پر بیٹھ کر اپنے ہی جیسے انسانوں سے سجدہ کرانا اپنا بنیادی حق سمجھتے تھے۔ جنکے سروں پر خدمتِ خلق کے بار امانت کی جگہ جاہ و شوکت اور کبر و غرور کا تاج رکھا جاتا تھا پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے نفسانی جذبات، حیوانی رجحانات اور کبر و نخوت کے جاہلی تخیلات سے مجرد کر کے خلافت کا جو ٹھیٹھ عقلی اور اخلاقی نظریہ قائم کیا اس پر انہوں نے کتنی حیرت اور اجنبیت کا مظاہرہ کیا۔ صرف اظہار حیرت ہی نہیں بلکہ اسے سفاہت اور بے عقلی پر محمول کیا؟ اسکی ایک ادنیٰ مثال تم ایرانی سردار کے دربار میں دیکھ سکتے ہو جہاں اسلامی سفیر ــــ جسکے صفحۂ دل سے جاہلیت کے نقوش مٹائے جا چکے ہیں اور جو توحید کا سبق پڑھکر پتھر کے ساکت و صامت بتوں کی پوجا کے ساتھ ساتھ حکام اور سلاطین کے متحرک بتوں کی پوجا کی یاد بھی بھول چکا ہے ــــ صلح و جنگ کے معاملات پر گفتگو کرنے جاتا ہے اور خودی و تمکنت کی

پوری شان کے ساتھ اس کے تکلف قالینوں کو روندتا اپنے بھدّے نیزے کی اَنی ان میں گڑوتا ہوا تخت پر بادشاہ کے برابر جا بیٹھتا ہے۔ امرائے دربار اس بے باکی اور جسارت پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ آخر یہ کس دربار اور مملکت کا آئین ہے کہ ایک معمولی سفیر حاکمِ وقت کو سجدہ کرنے کے بجائے اس مساویانہ شان کے ساتھ بادشاہ کے برابر جا بیٹھے۔ انسان پرست انسانوں سے دیکھا نہ گیا، تیوریاں چڑھ گئیں۔ یہ رنگ دیکھکر توحید کا دیوانہ سفیر بھی حیرت زدہ رہ گیا، اور یہ کہکر اٹھا اور چلا آیا کہ کیا تم اپنے ہی جیسے آدمیوں کی پرستش کرتے ہو؟ کیا حکومت کا تخت بھی تمہارا مسجود ہے؟ یہ پیشانی تو صرف ایک ہی تخت کے سامنے جھکنا جانتی ہے جسکا نام عرشِ الٰہی ہے۔ سفیر کی یہ "بے ادبی"، "تہذیب و تمدن سے ناآشنائی" اور "مجنونانہ بدد ماغی" دیکھکر انہوں نے کہا یہ کیسا غیر معقول مذہب ہے جہاں شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں جو تخت و تاج کا احترام کرنا بھی نہیں جانتا۔

بیت المقدس کی فتح پر فاروقِ اعظم ــــ وہ فاروقِ اعظم جنکا نام سنکر بڑے بڑے فراعنۂ وقت کے دل سینوں میں دہل جایا کرتے تھے ــــ جب اس شان کیساتھ شہر میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہوا ہے، وہ خود اونٹ کی مہار ہاتھ میں تھامے پیدل چل رہے ہیں اور پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے کپڑے جسم پر ہیں تو وہ عیسائی قوم جس نے بادشاہت کی قیصری شان دیکھی تھی اس عجیب منظر کو دیکھکر تصویرِ حیرت بن جاتی ہے۔ اسے یقین نہیں آتا کہ آیا خلیفہ اور بادشاہ کا جو خارجی مفہوم اس کی نگاہیں مشاہدہ کر رہی ہیں اسکا وجود بھی دنیا میں ہو سکتا ہے؟

اسلامی نظریۂ خلافت کے سلسلے میں صلح و جنگ کی تعلیمات پر بھی ایک نگاہ ڈالو کہ انکے ساتھ جاہلیت نے کیا برتاؤ کیا، اور اس "عجیب" نظریۂ جنگ کی بے لوثی و بے غرضی اور خالص للّٰہیت کو سمجھنے اور قبول کرنے سے اس نے کتنی بیگانگی اور وحشت محسوس کی۔ اسلام نے جب لوگوں کو دعوت دی کہ آؤ حق کی حمایت کرو، کفار کے بڑھتے ہوئے فتنوں کو دباؤ اور عدل کا بول بالا کرو، تو جہل

و نفاق کے مریضوں نے سوال کیا، ہم یہ سب کچھ تو کرینگے مگر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں ملیگا کیا؟ اس کا جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ کچھ ملنے کی خاطر جو لڑائی کی جائے وہ جاہلیت کی لڑائی ہے۔ اسلام کی لڑائی تمام ذاتی اغراض سے پاک ہے۔ اپنی ذات سے مال خرچ کرو، اپنی رسد خود لاؤ، اور اپنی جانیں قربان کرو، صرف اس لیے کہ خدا نے جو عدل اور نیکی کا قانون بھیجا ہے اسکی حکومت دنیا میں قائم ہو اور اس کے بندے اس قانون سے فائدہ اٹھائیں۔ اس خدمت کے معاوضہ میں اگر تم نے ایک اونٹ باندھنے کی رسّی کا بھی لالچ کیا تو تمہاری سب قربانیاں اکارت جائینگی۔ خدا کا دین تمہیں اس لیے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا کہ مال و دولت کے خزانے اور دوسروں کو غلام بنانے کے اختیارات تمہیں حاصل ہو جائیں۔ ہم کفار سے اس لیے لڑنے نہیں جا رہے ہیں کہ ان سے ہمارا کوئی زر و زمین کا جھگڑا ہے یا کوئی ذاتی پرخاش ہے یا وطنی و نسلی عداوت ہے۔ ان اغراض کیلیے تلوار اٹھانا اور انسان کا خون بہانا تو قطعاً حرام ہے۔ یہاں بجز دفع فساد اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اور کچھ مقصود نہیں۔ جن سے ہم لڑنے جا رہے ہیں ان کی دشمنی نہیں بلکہ عین ان کی خیر خواہی ہمیں میدان جنگ میں لے جا رہی ہے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ہمارے بھائی ہیں۔ اگر قانون الٰہی کی اطاعت پر راضی ہو جائیں تب بھی ہمیں ان سے کوئی وجہ پرخاش نہیں۔ اگر وہ راہ خدا میں روڑے اٹکانے سے باز آجائیں تب بھی ہماری انکی دوستی ہو سکتی ہے۔

جب پیغمبر علیہ السلام نے جہاد اسلامی کی یہ غرض و غایت بیان کی تو جاہل انسان حیرانی میں پڑ گیا۔ وہ صرف دو ہی قسم کی لڑائیوں سے واقف تھا۔ ایک وہ جو مال و دولت اور توسیع مملکت اور شہرت و ناموری کیلیے لڑی جائے۔ دوسری وہ جو فریق مقابل سے انتقام لینے کے لیے ہو۔ مگر ایسی لڑائی کا وہم و گمان بھی اس کے ذہن میں نہ تھا جو طمع اور انتقام دونوں کے جذبات سے خالی ہو، بلکہ محض فی سبیل اللہ ہو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ کس قسم کی جنگ ہے؟ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں اور معاوضہ میں کچھ بھی نہ چاہوں، حتیٰ کہ یہ بھی نہ چاہوں کہ لوگوں کو میری بہادری کا حال معلوم ہو اور وہ

میری تعریف کریں! میں حریف سے لڑنے جاؤں، نہ اس لیے کہ اس سے میری یا قوم و ملک کی عداوت ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ اسے سیدھا راستہ دکھانا مقصود ہے! جو شخص ابھی میرے بھائی کو قتل کر کے آیا ہے، اور ایک منٹ پہلے میری جان لینے کے درپے تھا، وہ محض کلمۂ شہادت پڑھ لے تو مجھ سے کہا جاتا ہے کہ اسے بھائی کی طرح گلے لگاؤں اور بھول جاؤں کہ وہ میرے بھائی کا قاتل اور خود میرے خون کا پیاسا تھا!

بدر کا معرکہ، جسے یوم الفرقان کہا گیا ہے، اسلامی تصور جہاد کی بلندی اور جاہلی تصور جنگ کی پستی کا بھی یوم الفرقان ہے۔ عقل و دیانت اور نفس و جاہلیت کے دواعی پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں اور ایک ہی ساعت میں اسلام کے انقلابی نظریات کا ایسا مظاہرہ ہوتا ہے کہ برسوں کی نشر و اشاعت میں بھی نہ ہوتا۔ مدعیان ایمان کی جماعت تین گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو عقل و بصیرت کی نعمت سے اچھی طرح نواز جا چکا ہے، جس کے دل و دماغ میں نفس پرستی اور جاہلیت کو نفوذ کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ دوسرا گروہ متوسطین اور ضعفاء کا ہے جو اسلام کے عقلی نظریات کو ہضم کرنے سے ابھی تک قاصر ہیں۔ تیسرا گروہ عبداللہ ابن اُبی اور اسکے منافقین کا ہے جن پر جاہلی تصورات پوری طرح مسلط ہیں۔ ان تینوں جماعتوں کی حالتوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرو۔ پہلی جماعت تو وہی دیکھ رہی ہے جو قرآنی تعلیمات اور اصول کے اندر انکی شفاف عقل اور بے آمیز فطرت انھیں دکھا رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسلام ہتھیار اٹھانے کا مقصد کیا قرار دیتا ہے۔ اس کا سینہ قوم پرستی اور زر پرستی کے جذبات سے بالکل پاک ہے۔ اسے اس کا مطلق خیال نہیں کہ حریف اپنا ہی ہم قوم ہے اور ہمارے نیزے اپنے ہی دل و جگر کے ٹکڑوں پر پڑنے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اسوقت انکے اندر اس قومی عصبیت اور حمیت کا بھی شائبہ تک موجود نہیں، جسکے لیے اپنے قبیلہ پر دوسرے قبیلہ والوں کی تلوار اٹھتے دیکھنا بھی ناقابلِ برداشت تھا، کجا کہ دوسرے قبیلہ والوں کو خود ساتھ لیکر اپنے قبیلہ

والوں پر چڑھ جانا۔ جاہلیت کے پرانے جذبات اسلام کے عقلی و فطری نظریات کے سامنے اس طرح دب کر فنا ہو چکے ہیں کہ ایکطرف یہ جماعت اپنے خونی بھائی بندوں پر انصار کو حملہ کرنیکی اجازت اور ترغیب دے رہی ہے، دوسری طرف اپنی مادی کمزوری اور قلت سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں۔ اس نے یقین کر رکھا ہے کہ فتح و شکست کا مدار قلت و کثرت کے ماسوا کسی اور شے پر ہے جسکا نام توکل علی اللہ ہے۔ تیسری طرف میدانِ جنگ میں حصول غنائم کے بجائے صرف احقاق حق اور دفع باطل اسکے پیشِ نظر ہے، اور اسلامی روح جہاد اس طرح اسکی روح سے ہم آغوش ہو چکی ہے کہ وہ مال و زر سے لدے ہوئے قافلہ کو چھوڑ کر شمشیر و سنان سے مسلح فوج کے مقابلہ پر جانے کو ترجیح دیتی ہے حالانکہ یہ جماعت اُس ماحول کی تربیت یافتہ رہ چکی ہے جہاں اس حیرت انگیز انقلابی نظریہ کا خیال ہی پیدا ہونا سرے سے ناممکن تھا کہ لڑائی انتقام یا حصول غنائم کے ماسوا بھی کسی غرض کیلیے لڑی جا سکتی ہے، یا فتح کا انحصار مادی قوتوں کی فراہمی کے علاوہ بھی کسی شے پر ہے، یا باپ بیٹے بھی ایک دوسرے کے مقابل آ سکتے ہیں۔

دوسری جماعت خوف سے ہراساں ہو رہی ہے۔ وہ تیر و سناں کے مقابل میں توکل کی طاقت کا تصور کرنے کیلیے تیار نہیں ہے۔ اس پر اس حقیقت کا انکشاف دشوار ہو رہا ہے کہ اللہ کی تائید غیبی ان مخلص مجاہدین کے کیونکر شامل حال ہوتی ہے جو اس کے حکم کے مطابق اپنی تمام مادی قوتوں کو جمع کر کے باطل کے مقابل میں لا کھڑا کرتے ہیں اور اس کے بعد صرف اللہ پر بھروسہ کر کے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس قصور نگاہ کے ساتھ وہ مقاصد جنگ کی اسلامی اسپرٹ کا بھی احاطہ نہ کر سکی قریش کے لشکر کی طرف منہ کرتے ہوئے تو اس پر نزع کی سی حالت طاری ہونے لگتی ہے لیکن نہتے تجارتی قافلہ پر پل پڑنے کیلیے وہ ہمہ تن تیار ہے اور نبی کو اسی کا مشورہ دے رہی ہے۔

تیسری جماعت نے حسب توقع نہ صرف جنگ میں عملاً شریک ہونے اور صبر و توکل کی طاقت کا اندازہ

لگانے میں اپنے عجز کا ثبوت دیا بلکہ اس نے اس عجیب و غریب حرکت کا مذاق بھی اڑایا، قافلہ کے سہل الحصول مال و متاع کو چھوڑ کر قوی تر دشمن سے لڑنے کیلیے جانے پر سخت حیرانی کا اظہار بھی کیا، مسلمانوں کی خود فریبی پر بزرگانہ ماتم بھی کیا اور جب دیکھا کہ ان کا ایمان اور توکل انھیں قریشی سیلاب کی ہیبت ناکیوں سے اس طرح بے خبر کیے ہوئے ہے تو بول اٹھے۔

غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (انفال - ۷) ان کے دین نے انھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے

اور اس کی وجہ بھی صاف ہے، جنگ کا یہ تصور اور فتح و شکست کا یہ فلسفہ اُن کے ذہن میں کیونکر آسکتا تھا جن کے نزدیک قوت کا منتہا لات و عزی کے حقیر پتھروں تک اور اغراض جنگ کا بلند ترین تخیل حصول غنائم تک محدود تھا؟ جاہلیت کے جو اسباق انھوں نے پڑھے تھے ان میں اس کا کوئی ذکر تو تھا نہیں کہ جو قوم محض اللہ کیلیے، نظام عالم کی برہمی اور شورش کو امن و عدل سے بدل دینے کیلیے اور سرکش دیے راہرو انسانوں کو سارے نظامِ کائنات سے ہم آہنگ بنانے کیلیے میدان میں آتی ہے وہ تنہا نہیں ہوتی، اس کی مدد کیلیے آسمان سے ملائکہ آتے ہیں بلکہ تمام عناصر عالم کی ہمدردی اور حمایت اسے حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی اسی مشینری کے اجزا ہیں جسے یہ لوگ درست کرنے اٹھے ہیں۔

وطن پرستی اور قومیت کا غرور دونوں چیزیں جاہلیت کے اصول موضوعہ میں سے تھیں۔ اپنی نااہلی کے باوجود اپنے ملک پر حکومت کرنا، اس میں عزت کی زندگی بسر کرنا ملک کے باشندوں کا پیدائشی حق تھا۔ اپنی صالحیت، عدل پروری اور نیکوکاری کی بنا پر کسی جماعت کا بلا امتیاز قوم و وطن، حقدار حکومت ہونا بالکل ایک اچھوتا اور ناقابلِ فہم تخیل تھا۔ لیکن جب خلافتِ الٰہی کی تجدید کا وقت آیا تو قومیت اور وطنیت کا بت توڑ کر اعلان کر دیا گیا کہ:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ بے شک زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہیں۔

استحقاق حکومت کی یہ نامانوس صدا کانوں میں پڑی تو قوم پرست منافقین کے سینوں میں آگ لگ گئی - قوم پرستوں کے سردار رئیس المنافقین عبداللہ ابن اُبی نے اس نئے آئیڈیل کو ناکام بنانے کی پے بہ پے کوششیں کیں - وہ انصار اور مہاجرین کی اسلامی قومیت کو کسی طرح نہ سمجھ سکتا تھا - اس کی نگاہ میں یہ دو الگ قومیں تھیں، اور وہ ہجرت کے معاملہ کو اس نظر سے دیکھتا تھا کہ ایک غیر قوم کے لوگ باہر سے آکر مذہب کے نام سے اسکی قوم کو اپنے نفع کیلیے استعمال (exploit) کر رہے ہیں - اُسے انصار پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیوں اپنی پرانی قومیت کے تخیل کو بھول کر نئی قومیت کا دو چکہ "کھا رہے ہیں - وہ، اور اسکے ہم خیال منافقین، جو سب کے سب انساب و اوطان کو بنائے قومیت سمجھتے تھے"، ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ انصار میں قدیم جاہلیت کے جذبات کو تازہ کریں، اور مہاجرین سے ان کو الگ کرنیکا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں - مدینہ میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان یہ ایک مستقل کشمکش تھی جو کئی سال تک جاری رہی - ایک طرف اسلام پوری طاقت کے ساتھ دماغوں میں اس انقلابی نظریہ کو اتار رہا تھا جسکی رو سے انسانیت کی تقسیم بجز کفر و دین کے اور کسی بنیاد پر نہیں ہوسکتی اور دوسری طرف جاہلیت ایک ایک قدم پر اسکی راہ روکتی اور اپنے پرانے نظریۂ قومیت کو سامنے لاتی تھی -

غزوۂ بنی المصطلق میں کسی چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر (جہجاہ ابن مسعود) نے ایک انصاری (سنان الجہنی رضی) کو طمانچہ مار دیا، انصاری نے قدیم دستور کے مطابق یا للانصار! کا نعرہ لگایا، مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، چشم زدن میں تلواریں بے نیام ہو گئیں - اگرچہ فوراً ہی اسلامی اخوت نے آکر جاہلیت کی اس چنگاری کو بجھا دیا - لیکن عبداللہ بن ابی کے دل کی آگ بھڑک اٹھی - اس نے اوس و خزرج کے پرانے نظریات اور قومی جذبات کو ابھارتے ہوئے کہا :

سمن کلبك یا کلك ۱ ناد ۲ ﷲ اپنے کتے کو خوب موٹا کرو تاکہ وہ تمہیں پھاڑ کھائے

لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل۔ خدا کی قسم اگر ہم مدینہ لوٹے تو عزت رکھنے والا (یعنی خود) ذلیل کو (سرکارِ عالم اور مہاجرین) نکال باہر کریگا

اس کا مطلب یہ تھا کہ اے انصار تم نے اس سانپ کو خود آستینوں میں پالا ہے، نتیجہ دیکھتے ہو کہ وہ تمہارے منہ آرہے ہیں، تمہاری پناہ میں رہکر اور تمہاری روٹیاں کھاکر اب تمہارے ہی اوپر اپنا اقتدار جمانا چاہتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب اور ہمارے لیئے رسوا کن بات ہے کہ ایک بیرونی قوم ہماری قومی عزت اور خودداری کو ڈھا دینے اور اس پر اپنی فرمانروائی کا تخت بچھانے کا حوصلہ کر رہی ہے، اور حکومت و خلافت کا یہ پُر فریب نظریہ پیش کر رہی ہے کہ اللہ کی زمین محض اُس کے صالح بندوں کی وراثت ہے، اس پر حکومت کرنا انھیں کا حق ہے اور قومیت و وطنیت کے سارے فطری حقوق بے معنی ہیں!

مساوات کا مقام انسانیت کے بنیادی حقوق میں جس قدر بدیہی اور نمایاں ہے، دنیا اسی قدر اسے فراموش کر چکی تھی۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ اگر کسی معمولی قبیلہ کا کوئی فرد کسی دوسرے معزز قبیلہ کے کسی فرد یا کسی بڑے سردار کو قتل کر ڈالتا تھا تو اسکے قصاص میں قاتل کیساتھ ساتھ اس کے خاندان کے متعدد بے گناہ اشخاص بھی قتل کیے جاتے تھے، یعنی ایک صاحب جاہ و حشمت انسان کا خون معمولی انسان کے خون سے دس بیس گنی زیادہ قیمت رکھتا تھا۔ غربت و امارت کا یہی جاہلی امتیاز اہل کتاب کے اندر بھی قبولیت حاصل کر چکا تھا۔ ان کے تعزیرات شرعی کی یہ ایک متفق علیہ دفعہ تھی کہ اگر کوئی بڑی ناک رکھنے والا آدمی جرمِ زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوڑے مارنے کی سزا دیجائے اور اگر بدقسمتی سے زانی کوئی معمولی اور کم حیثیت انسان ہو تو اس پر حدِ رجم جاری کی جائے۔

اسلام نے جب حقیقت کے مٹے ہوئے نقوش ابھارنے شروع کیے تو قانون مساوات کو بھی از سرِ نو زندہ کیا، اور اسے اپنے نظامِ سیاست کا سنگِ بنیاد قرار دیکر اعلان کر دیا کہ قانون الٰہی کی نگاہ میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ سب کے حقوق کی حرمت یکساں ہے، حتی کہ اگر خود نبی کی بیٹی اور اس کی

نورعین چوری کرے تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ لیے جائینگے۔ لیکن جاہ پرست دنیا اس ہتک کو برداشت نہ کرسکی۔ خلیفہ دوم کے عہد میں ایک نومسلم رئیس (جبلہ بن ایہم غسانی) حج کیلیے آیا۔ اثنائے طواف میں کسی معمولی انسان سے دھکا لگ گیا۔ اسکی رئیسانہ تمکنت اس گستاخی کو گوارا نہ کرسکی اور اس نے فوراً ایک طمانچہ رسید کردیا۔ معاملہ کورٹ میں پہنچا۔ عدل فاروقی نے فیصلہ دیا کہ مظلوم اپنے ظالم کے چہرہ پر اتنی ہی شدت کا طمانچہ مارے۔ وہ رئیس حیرت سے منہ تکتا رہ گیا۔ آخر یہ حیرت ارتداد تک پہنچی۔ اس نے کہا مجھے تو اس اندھیر کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جس مذہب کے قانون میں شریف و رذیل کا کوئی امتیاز نہ ہو اس پر ایمان لانا عقل و ضمیر کی توہین ہے۔

جاہلیت کی سوسائٹی مختلف طبقات میں بٹی ہوئی تھی جس میں شریف و وضیع، امیر و غریب، عالی نسب و کم نسب کے بہت سے مراتب تھے، اور ان مراتب میں سب سے نیچا درجہ غلاموں کا تھا۔ اسلام نے سرے سے طبقات کی اس تقسیم ہی کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ سب انسان مساوی الاصل ہیں اور ان میں بجز تقویٰ کے اور کوئی معیار بزرگی و خوردی نہیں۔ یہ انقلابی نظریۂ مساوات ذوق جاہلیت پر سخت گراں گذرا، کیونکہ تفاخر ہی تو نفس حیوانی کی رگ جان ہے۔ اسلام نے جب اس پر نشتر چلایا تو جاہلیت بلبلا اٹھی سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن، سردار قریش عبدالمطلب کی نواسی، اور عرب کے سب سے اونچے خاندان کی بیٹی زینب بنت جحش کی شادی ایک ایسے شخص سے کردی جو طبقات کی جاہلی تقسیم میں سب سے نیچے درجے پر تھا، یعنی آزاد کردہ غلام (حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ)۔ جاہلیت اس شدید انقلابی حرکت پر اس قدر چراغ پا ہوئی کہ بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ مدینہ کے منافقین ڈر گئے کہ یہ وبا کہیں پوری سوسائٹی میں نہ پھیل جائے۔ انکی عورتوں نے اسکے خلاف چرچے شروع کیے۔ خود حضرت زینب کو ورغلانا اور عار دلانا شروع کیا اور جاہلی جذبات کو بھڑکا کر انھیں اتنا برانگیختہ کیا کہ آخرکار زوجین میں منافرت پیدا ہوگئی، اور طلاق ہی نے اس قضیہ کو طے کیا۔

غلام کی طرح قیدی بھی انسانی مراعات کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بدر کے قیدیوں کو جب صحابۂ کرام نے حسب ارشاد نبوی روٹی کھلائی اور خود کھجوروں پر اکتفا کرنے لگے، تو قریش کے اسیرانِ جنگ مارے شرم کے گردنیں، جھکا لیتے اور حالت حیرانی میں اپنے دلوں سے پوچھتے کیا اس آسمان کے نیچے قیدی کے ساتھ یہ برتاؤ بھی ہوتا ہے؟

عرب کا معاشرتی نظام رسوم جاہلیت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کھانے پینے میں، نشست و برخاست میں، نکاح و طلاق میں، من گھڑت قیود مذہبی اصول کی حیثیت سے داخل تھیں، اور ان کا توڑنا سوسائٹی کی نگاہ میں بدترین گناہ تھا۔ ان رسمی تصورات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ متبنّٰی اصل بیٹے کا حکم رکھتا ہے اور اسکی بیوہ یا مطلّقہ بیوی سے شادی کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح اصل بیٹے کی بیوی سے۔ حضرت زینب کو جیسا کہ اوپر گذر چکا ایک غلام سے رشتہ ازدواج، منافق عورتوں کے طعن و تشنیع اور آخر میں مطلّقہ ہو جانیکے جو بہم صدمات پہنچے تھے انکا مداوی صرف ایک طریقہ سے ممکن تھا، وہ یہ کہ انہیں ام المومنین کا درجہ عطا کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خواہش دل میں رکھتے تھے لیکن سوسائیٹی کی جاہلانہ ذہنیت سنگِ گراں بنکر راستے میں حائل تھی۔ قرآن نے حکم دیا کہ اس جاہلانہ تصور پر بھی ایک کاری ضرب لگاؤ، اور ان رسم پرستوں کی کچھ پرواہ نہ کرو:۔

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (احزاب)

تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے ہو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ اس امر کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

آخر کار جب خدا کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے نکاح کر لیا تو منافقین میں پھر وہی شور برپا ہوا جو پہلے حضرت زیدؓ سے نکاح کرنے پر ہوا تھا۔ انہوں نے ایک قدیم سنت

کی خلاف ورزی پر مطاعن کی بوچھاڑ کردی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی بہو سے بھی نکاح کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن پیغمبر آخرالزماں کی بعثت تو اس غرض کیلیے تھی ہی کہ وہ خود ساختہ رسوم و قیود کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیں۔ رحمۃ للعالمین کا منصب یہ بھی تو تھا کہ انسان کو ان زنجیروں سے نجات دلائیں جو اس نے اپنی ناسمجھی سے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی تھیں اور وہ بوجھ اسکے سر سے اتاریں جنہیں اس نے خود اپنے اوپر لاد رکھا تھا اور خود ہی ان کے نیچے پس رہا تھا۔ لہذا منافقین کے اس تمام شور و غوغا کے باوجود حق کی تلوار نے بے نیام ہو کر اس قید بیجا کو کاٹ ڈالا۔

جو قوم حقائق کو چھوڑ کر ظواہر پر اپنا نظام عمل مرتب کرتی ہے جنکی تہ میں نیکی اور تقوی کے عناصر موجود نہیں ہوتے اس پر کسی رسم یا قدیم رواج کی مخالفت نہایت شاق گذرتی ہے کیونکہ یہی رسوم تو اس کے دین و دنیا کی کل کائنات ہوتی ہیں۔ اس کی نگاہ میں ان ظاہری بندشوں کی عظمت اصل دین کی عظمت سے زیادہ ہوتی ہے اور جب ظاہری پردوں کو چاک کر کے اصل روح اور مقصد کی طرف انکی رہنمائی کیجاتی ہے تو دفعتہً انکے رگ و پے میں نفرت اور جاہلی حمیت آتش سیال بن کر دوڑنے لگتی ہے۔ وہ اشکال اور مظاہر کی تبدیلی کو اصل مقصد اور حقیقت کی تبدیلی خیال کر کے مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تشریع اسلامی کے دوران میں اس ذہنیت سے بھی اسلام کو سخت مقابلہ پیش آیا۔ جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو بہت سے منافق علانیہ مرتد ہو گئے۔ قرنوں سے بیت المقدس قبلہ چلا آرہا تھا اور اسلام نے بھی ابتداءً ایک مدت تک اس کو قبلہ بنایا تھا، اسلیے وہ جاہل یہ سمجھتے تھے کہ قبلیت ایک خاص سمت اور مقام سے قدرتی تعلق رکھتی ہے۔ اب جو قبلہ بدلا گیا تو انہوں نے کہا یہ کیا تماشہ ہے کہ خدا بیت المقدس سے نکل کر کعبہ میں آ بیٹھا؟ کیا اب تک جتنی نمازیں اُس طرف رخ کر کے پڑھی گئیں سب غیر اللہ کیلیے تھیں؟ قرآن نے تحویل قبلہ کی حکمت بیان کر کے ان کے اس جاہلی تصور کو دور کرتے ہوئے جواب دیا کہ قبلہ کوئی مقصود بالذات شے نہیں۔ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔

جس طرف تم رخ کرو وہیں خدا موجود ہے۔ کسی سمت خاص کو اس کی نگاہوں میں فضیلت اور محبوبیت حاصل نہیں، نہ کسی جہت میں وہ محصور ہے، اور نہ کسی قبلہ کی طرف رخ کرنا بجائے خود نیکی اور تقویٰ ہے بلکہ ثواب اور نیکی درحقیقت ایمان اور اعمال صالحہ کا نام ہے، لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ الخ۔ لیکن جاہلیت اور ظواہر پرستی کی ماری ہوئی عقل اس حقیقت کو حقیقت سمجھنے کیلیے کب تیار تھی۔ کتنے ہی مذبذب اور کتنے ہی مرتد ہو کر رہ گئے۔

اسلام نے جب آنکھیں کھولیں تو اس کے اردگرد معاشیات اور اقتصادیات کا ایک خالص ظالمانہ نظام قائم تھا، جسکی پوری عمارت رہزنی اور سنگدلی پر کھڑی کی گئی تھی۔ غریب پر گویا رزق کے دروازے بند تھے۔ پیسہ ان کے ہاتھ میں آنیکا کوئی راستہ نہ پاتا تھا، مگر ہاتھ سے جانیکے بہتیرے راستے تھے۔ اس کے برعکس عیش پرست امرا کے ہاتھ میں وہ صرف آنا جانتا تھا نکلنے کی کوئی اختیاری راہ نہ پاتا تھا۔ اسلام اس دردانگیز منظر کی تاب کہاں سے لاتا۔ اس نے دولت مندوں کو کسب مال کے جائز حقوق دیتے ہوئے بقیہ تمام جارحانہ اور غیر عادلانہ طریقوں سے روک دیا۔ فقرا و مساکین کی معاشی فلاح کیلیے دو اصول متعین کیے۔ ایک تو فرضیت زکوٰۃ، دوسرا تحریم ربوا، کیونکہ ربوا وہ خونخوار درندہ ہے جو مفلس و ناتواں حاجت مندوں ہی پر جھپٹتا اور ان کا خون چوس کر انھیں موت کی آغوش میں ڈال دیتا ہے۔

صدقہ و زکوٰۃ کا فلسفہ اور معرف شارع نے جب یہ بتایا:

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِكُمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فُقَرَائِكُمْ۔ — یہ صدقہ تمہارے مالداروں سے لیکر تمہارے فقرا پر خرچ کر دیا جاتا ہے،

اور لوگوں کو اس پر ابھارا تو کفار و منافقین نے کہا:

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ — (انفاق کا حکم سن کر) کفر کرنیوالوں نے مومنوں سے کہا کیا ہم اس شخص کو کھلائیں جسکو اگر اللہ چاہتا

اِلَّا فِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (یٰسین - رکوع ۳) تو کھلا دیتا۔ تم تو بالکل صریح گمراہی میں ہو۔

یعنی یہ صدقہ و زکوٰۃ کیا چیز ہے؟ اگر خدا ان ننگوں کو کپڑا اور بھوکوں کو کھانا دینا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا۔ اس کی مشیت نے انھیں اس نعمت کا مستحق سمجھا ہی نہیں، پھر جسے اس نے بھوکا رکھا اسکو کھانا دینے کی جسارت ہم کیوں کریں، اور وہ ہم پر یہ فریضہ عائد کیسے کر سکتا ہے؟ یہ بات تو بڑی ہی عجیب ہو گی۔

سود کی ممانعت تو ان کے نزدیک سرے سے کسی توجہ کے قابل تھی ہی نہیں کیونکہ انھیں اس میں معقولیت کا کوئی پہلو نظر آتا ہی نہ تھا ان کا قول تھا کہ:

اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بقرہ - ۳۸) تجارت تو ربوا ہی کی طرح ہے۔

یعنی بجائے اس کے کہ سود کی اباحت کیلیے وہ اُسے بیع کے مماثل قرار دیتے اور بیع کی اباحت کو بطور اصل تسلیم کرتے ہوئے ربٰو کے جواز کیلیے اُسے بیع کیساتھ تشبیہ دیتے، انہوں نے علت ربوا ہی کو اصل قرار دیکر تجارت کو اس سے تشبیہ دی، گویا سودی منافع کی علت تو قطعی اور بحث و تمحیص سے بالکل بے نیاز ہے ہاں منافع تجارت کے جواز کو ثابت کرنے کیلیے اتنا کہنا پڑے گا کہ اسکی نوعیت بھی ربوا کی سی ہے جو مباح الاصل ہے، یہ تھا نفسِ حیوانی کا کرشمہ!

یہاں استقصار مقصود نہیں بلکہ مثالاً ان واقعات کی طویل فہرست کا ایک صفحہ پیش کر دیا گیا ہے جو اسلام اور جاہلیت کی ابتدائی جنگ میں منظرِ عام پر آئے، اور یہ واقعات بھی محض قولی ہیں یعنی ان کے ذریعہ اسلام سے جاہلیت کی فطری اجنبیت اور وحشت کا افسانۂ حقیقت ہم خود اسی کی زبان سے سُن رہے ہیں۔ ورنہ اگر جاہلیت کے عملی واقعات اور اس کے عام نظریات کو قلمبند کیا جائے اور ان سے اسلامی تعلیمات و اصلاحات کا موازنہ کیا جائے تو شاید دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہونگے۔ پھر بھی جو معدودے چند واقعات اوپر کی سطروں میں بیان کیے گئے ہیں اتنے ہی تصویر کے اصلی خط و خال نمایاں کرنے

کیلیے کافی ہیں - ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جاہلیت اور نفسانیت کی غلام دنیا نے قرآن کی فطری تعلیمات اور عقلی تصورات کے ہر ہر جزئیہ سے کتنی بیگانگی کا ثبوت دیا ہوگا اور اسلام کی "غریب" آواز سُن کر حیرت اور استہزاء کے کتنے بلند قہقہے فضا میں گونج اُٹھے ہونگے، جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بظاہر "اجنبی اور غیر مانوس" صدا پر جن پاک نفسوں اور سچی بصیرت رکھنے والوں نے ابتدا میں لبیک کہی وہ خود اجنبی اور قابل صد طعن و تشنیع بن گئے تھے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِھِمْ یَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَھْلِھِمُ انْقَلَبُوْا فَکِھِیْنَ ۔ (تطفیف - ۱)	مجرمین ایمان لانے والوں پر ہنستے تھے۔ وہ جب ان کے قریب سے گذرتے تو باہم (راہ طعن و تمسخر) اشارے کرتے ہوئے، اور جب اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹتے تو نشاط سے چہکتے ہوئے۔

گویا ان کا وجود ہی سراپا عجائب کدہ بن گیا تھا - پھر وہ وقت آیا کہ یہ اجنبیت ناقابلِ معافی جرم قرار دے دی گئی، زبانی چھیڑ تلواروں کی جھنکار میں تبدیل ہوگئے اور جاہلیت نے اپنی حیرت کو غیظ و غضب سے بدل کر آہنی زنجیروں اور تیر و سناں کی نوکوں سے اس نامانوس آواز کو دبانا شروع کر دیا اگرچہ قدرت اس کے حوصلوں کے نامراد ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

(باقی)